ڈاکٹر صغیر افراہیم

پریم چند کی نئی قرأت اور کفن

A fresh reading of great literature never fails to provide new pleasure and a new interpretation. Such is the great short story *Kafan* by Prem Chand, one of the early exponents of the Urdu short story. It can be placed among the masterpieces of world literature without any apprehension as it uncovers a number ruthless social attitudes and offers to fight them under trying circumstances. *Kafan* is thus examined with a fresh look at it.

~~~~~~~~~~

پریم چند کا ہمارے افسانوی ادب میں ایک منفرد مقام ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں کا محور دیہات ہے۔ وہ شاید پہلے ہندوستانی ادیب ہیں جنہوں نے شعوری طور پر کشن کے ذریعے دیہی زندگی کے مسائل سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی اور اس لحاظ سے آخری بھی کہ جن دیہی فضاؤں میں ڈوب کر انہوں نے اپنے افسانوں کو جنم دیا پھر کسی دوسرے ادیب نے اس جانب اتنی بھرپور توجہ نہیں دی۔ یہ تسلیم کہ ہر زمانے کے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ پریم چند کے عہد کے دیہاتوں میں اور آج کے دیہاتوں میں نمایاں فرق آچکا ہے۔ مسائل اس وقت بھی تھے اور آج بھی ہیں مگر آج کی نوعیت اور تقاضے بدلے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود جدید حالات میں پریم چند کی تخلیقات کی اہمیت برقرار

Scanned by CamScanner
~~~~~~~~~~

ہے۔ ہمارا افسانوی ادب جب کسی دوسرے پریم چند کی جستجو کرتا ہے تو پریم چند ہی اوّل اور آخر دکھائی دیتے ہیں جنھوں نے ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ایک مکمل ہندوستانی ادیب کے فرائض انجام دیے۔

پریم چند اردو کے پہلے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ حقیقت نگاری اور دیہی زندگی کے مسائل کی ابتدا بھی اردو افسانوں میں انھی کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ انہوں نے اردو ہندی میں تقریباً ۲۸۰ افسانے لکھے لیکن جامعہ دسمبر ۱۹۳۵ء کے شمارہ میں شائع ہونے والا ان کا افسانہ "کفن" ان کے افسانوی سفر میں آخری عہد کی یادگار، افسانوں میں سب سے کامیاب تخلیق اور فنی چابک دستی کا اعلیٰ مظہر ہے۔ سلیم اختر کی اس رائے سے اتفاق کے ساتھ:

> "پریم چند نے اردو میں مختصر افسانہ کی روح کو سمجھتے ہوئے اس کے تکنیکی لوازم کو پہلی مرتبہ مروج اور مقبول ہی نہ کیا بلکہ "کفن" ایسے سنگ میل کی حیثیت اختیار کر جانے والے افسانے سمیت لاتعداد افسانوں میں افراد کے باہمی عمل اور ردعمل کے لیے دیہاتی زندگی، اس کے گوناگوں مسائل اور ان سے وابستہ تمنیوں کو پس منظر بنا کر جو طرح ڈالی وہ اب ایک باقاعدہ روایت کی صورت اختیار کر چکی ہے۔"(۱)

"عشق دنیا و حب الوطن" سے لے کر "کفن" تک ان کی ۲۸ سالہ ادبی مسافت میں افسانہ نگاری کی روایت کی مکمل تاریخ پوشیدہ ہے۔ اس حد تک مکمل کہ اردو افسانہ کی تعمیر و تشکیل کی تمام اہم کڑیاں ہمیں پریم کے افسانے میں مل جاتی ہیں۔

ماہرین پریم چند پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر جعفر رضا، پروفیسر محمد حسن وغیرہ "کفن" کو فکری اور فنی اعتبار سے اردو کی لازوال کہانی تسلیم کرتے ہیں۔ بلاشبہ "کفن" پریم چند کی شاہکار تخلیق ہے اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کا یہ مشورہ نہایت درست ہے:

> کفن کے فنی کمال اور اس کی معنویت کا نقش ابھارنے کے لیے

Scanned by CamScanner

اسے تمثیلی طور پر نہیں بلکہ Irony کی سطح پر پڑھنے کی ضرورت ہے" کیونکہ "پوری کہانی کی جان حالات کی وہ Irony (ستم ظریفی) ہے جس نے انسان کو انسان نہیں رہنے دیا اور اسے Debase اور Dehumanise کر دیا ہے۔" (۲)

پروفیسر آل احمد سرور کے الفاظ میں:

"میں اسے اردو کی بہترین کہانیوں میں سمجھتا ہوں۔ اس میں ایک لفظ بھی بے کار نہیں۔ ایک نقش بھی دھندلا نہیں، شروع سے آخر تک چستی اور تلوار کی سی تیزی اور صفائی ہے۔" (۳)

شمس الرحمن فاروقی رقم طراز ہیں:

"میں کفن کو بے تکلف دنیا کے افسانوں کے سامنے رکھ سکتا ہوں..... یہ افسانہ (اور بہت سے پہلوؤں کے علاوہ) Black Humory کا شاہ کار نمونہ ہے اور اردو افسانے میں ایک نئے اسلوب کا آغاز کرتا ہے۔" (۴)

پروفیسر ابوالکلام قاسمی اس بابت لکھتے ہیں:

"میرے نزدیک اس کہانی کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ یہی کہانی اردو کی وہ کہانی ہے جس نے پریم چند کی روایت کو آج تک زندہ رکھا اور آگے بڑھایا ہے۔ "کفن" ہی وہ کہانی ہے جو ۱۹۳۵ء سے آج تک کے پینتالیس سال کے عرصے پر پھیلی ہوئی افسانہ نگاری کو وہ بنیاد فراہم کرتی ہے جس سے پریم چند کے بعد کے افسانہ نگاروں نے حقیقت نگاری کا سلیقہ سیکھا اور یہی افسانہ ترقی پسند افسانہ نگاری کے لیے ایک اساس بن کر سامنے آیا۔" (۵)

Scanned by CamScanner

پریم چند کی یہ کہانی اس لیے پسند کی جاتی رہی ہے کہ اس میں آدرش نہیں، رومانیت نہیں، تکلف نہیں، بیجا پاس و لحاظ نہیں اور اگر انگشت نمائی ہوئی بھی ہے تو کچھ اس طرح کہ کہانی کی بنیاد غیر حقیقی، غیر انسانی ہے۔ دراصل پریم چند یہی تو واضح کرنا چاہتے تھے کہ دیکھو مہذب سماج میں ایسا بھی ہوتا ہے جو نہیں ہونا چاہیے اور اسی لیے "کفن" کی کہانی بظاہر روز مرہ کے واقعات سے دور لیکن اس کے حقائق سے بے حد قریب ہے۔ اس کا مرکزی خیال وہ استحصال ہے جو برس ہا برس طبقہ وارانہ تقسیم، قدیم ہندوستانی زرعی سماج اور انگریزی حکومت کے نوآبادیاتی نظام میں کمزور طبقے کے ساتھ روا رکھا گیا اور جس کے نتیجہ میں ایسے لوگ وجود میں آئے جن کے افعال و اعمال سے گھن محسوس ہوتی، جن کی ظاہری شکل و صورت، عادات و اطوار قابل نفریں معلوم ہوتے۔ گھیسو اور مادھو کے توسط سے ذرا ماضی بعدی میں جھانک کر دیکھیے تو ان جیسے ہزاروں لاکھوں رینگتے ہوئے افراد نظر آئیں گے جو بدترین حالات کے شکار تھے۔ یہ مجبور لوگ غلاموں کی سی زندگی بسر کرتے اور اچھوت یا شودر کہلاتے جن کے سائے سے بھی لوگ پرہیز کرتے۔ وہ نہ تو مقدس کتابوں کو چھو سکتے اور نہ مندروں میں جاسکتے۔ تعلیم کا سوال تو ان کے لیے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ پینے کا پانی بھی ایک مسئلہ ہوتا۔ ہر بستی کے باہر ایک کنواں ان کے لیے مخصوص تھا۔ مادی اور معاشی ترقی کے تمام راستے ان کے لیے مسدود تھے۔ دو وقت کی روٹی صحیح معنوں میں ان کو میسر نہ تھی۔ گھر کے سارے افراد کی محنت پر پیٹ بھرتا تو تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا نہ ہوتا۔ دھوتوں کا جھوٹن انہیں کھانے کو ملتا۔ سالہا سال جانوروں کی طرح انہیں برتا اور اتنا کچلا گیا کہ ان میں سے کچھ کے لیے تو زندہ رہنے کی جدوجہد کا جذبہ ہی ختم ہوگیا اور یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ محنت کا صلہ ملتا نہیں تو پھر وہ محنت کس کے لیے کریں، عجب بے بسی میں مبتلا کرنے والا تھا۔ اس پس منظر میں وہ طبقہ نفسیاتی گتھیوں کا شکار ہوتا گیا جس کے نتیجہ میں نسلاً بعد نسل شودروں میں ایسے افراد ابھر کر سامنے آئے جن کو پریم چند

Scanned by CamScanner

نے اپنے افسانوں خون سفید، معصوم بچہ، صرف ایک آواز، نجات، دودھ کی قیمت، سوا سیر گیہوں، کفن وغیرہ میں مرکزی کرداروں کی جگہ دے کر ہمارے مہذب سماج کی نہایت بھیانک مگر سچی تصویر کشی کی ہے۔

اردو افسانے کی تاریخ میں سنگ میل اختیار کر جانے والی کہانی "کفن" تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کا محور ہندوستان کا ایک روایتی گاؤں ہے۔ وہاں کی بیشتر آبادی مزدوروں اور کسانوں کی ہے۔ افسانہ کے پہلے حصے میں رات کا وقت ہے۔ ایک جھونپڑے سے بدھیا کی دل خراش چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ باہر دروازے پر گھیسو اور مادھو بیٹھے ہوئے الاؤ کے گرد بیٹھتے ہیں۔ ذات کے چمار، ان لوگوں کی زندگی غربت اور افلاس سے پر ہے۔ گھیسو، مادھو کا باپ اور بدھیا، مادھو کی جوان بیوی ہے۔ باپ بیٹے انتہائی کاہل اور کاہل ہیں۔ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے آلو، مٹر یا گنے وغیرہ چرا لاتے یا پھر کسی درخت سے لکڑی کاٹ کر اسے بیچ آتے اور اپنا کام چلاتے۔ محنت مزدوری سے کتراتے۔ بہو کے آنے کے بعد، دونوں اور بھی حرام خور ہو جاتے ہیں۔ بدھیا ان سے مختلف ہے۔ وہ جفاکش اور مخلص ہے۔ محنت و مزدوری کر کے ان کا پیٹ بھرتی ہے لیکن ایک سال بعد، جب وہ درد زہ سے پچھاڑیں کھاتی ہے اور ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ وہ اندر جا کر اس کو دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے ہیں الاؤ کے نزدیک بیٹھے، بھنے ہوئے گرم گرم آلو نکال نکال کر کھاتے، پانی پیتے اور وہیں پڑ کر سو جاتے ہیں۔ افسانہ کے دوسرے حصہ میں رات صبح میں داخل کر اور زندگی، موت سے ہمکنار ہو کر سامنے آتی ہے۔ مادھو اندر جاتا تو بدھیا کو مرا پاتا ہے۔ وہ بھاگ کر گھیسو کو خبر کرتا ہے۔ دونوں مل کر ایسی آہ کرتے کہ پڑوسی سن کر دوڑے آتے اور "رسم قدیم کے مطابق" ان کی تشفی کرتے ہیں لیکن کریا کرم کی فکر انہیں زیادہ رونے دھونے سے باز رکھتی ہے۔ دونوں پہلے زمیندار کے پاس پہنچتے ہیں۔ اپنی جھوٹ کے سہارے بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ موقع کی نزاکت دیکھ کر زمیندار ان کو

Scanned by CamScanner

دو روپے دے دیتا ہے۔ پھر دونوں زمیندار کا حوالہ دے کر، دیگر آبادی سے بھی تھوڑا تھوڑا وصول کرتے ہیں۔ اس طرح ''ایک گھنٹے میں'' ان کے پاس'' پانچ روپے کی معقول رقم جمع'' ہوجاتی ہے۔ افسانہ کے تیسرے حصہ میں دونوں کفن خریدنے بازار جاتے ہیں۔ گھومتے پھرتے شراب خانہ میں داخل ہوجاتے ہیں۔ وہاں وہ خوب پیتے ہیں اور لذیذ کھانوں سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ سارا روپیہ اڑا دیتے ہیں۔ بدمست ہوکر ناچتے گاتے ہیں اور مدہوش ہوجاتے ہیں۔

پرخار حقیقی دنیا سے فلمی دنیا میں قدم رکھنے والا فنکار وہاں کی تصویری اور تصوراتی دنیا سے تو جلد ہی بیزار ہوجاتا ہے مگر تکنیکی ہنرمندی سے کچھ اور واقف ہوجاتا ہے۔ مذکور کہانی میں وہ سب سے پہلے قاری کو خبر دیتا ہے۔ پھر ایک تصویر ابھارتے ہوئے خبردار کرتا ہے۔ رات کے سناٹے سے شروع ہوکر شام کی سیاہی میں جذب ہوجانے والی یہ کہانی، دن کے اجالے کی سیاہ بختی کو منور کرتی ہے۔ عام قاری پہلی قرأت میں تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسے یہ تو سمجھ میں آجاتا ہے کہ دونوں بے حد دم توڑتی ہوئی عزیزہ کو دیکھنے نہیں جاتے ہیں مگر یہ سوال ذہنی کچوکے لگاتا ہے کہ وہ کیسا گاؤں تھا اور کیسے پڑوسی جو ایک نیک اور بے بس عورت کی دل خراش صدا کو نہیں سنتے جب کہ'' جاڑوں کی رات تھی۔ فضا سناٹے میں غرق۔ سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہوگیا تھا۔ ایسے خاموش ماحول میں کلیجہ تھام لینے والی آواز انہیں سنائی نہیں دیتی لیکن دن کے پرشور ماحول میں دونوں بے غیرتوں کی آہ و زاری سن کر دوڑتے آتے ہیں اور ''غم زدوں کی تشفی کرنے لگتے ہیں۔'' اسی طرح یہ منظر بھی عام قاری کے لیے کچھ عجیب ہوتا ہے کہ کفن اور لکڑی کی فکر میں دونوں لاش کو اکیلا چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ کام تو کوئی ایک بھی کرسکتا تھا اور دوسرا لاش کے پاس بیٹھا ڈھونگ رچا سکتا تھا۔ افسانے میں اس کا ذکر بھی ہے۔ گھیسو، مادھو کو بتاتا ہے: ''میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں۔'' عام قاری اسے درگزر کرتا ہوا آگے

Scanned by CamScanner

بڑھتا ہے تو پھر اسے ذاتی جھٹکا لگتا ہے۔ وہ دونوں پانچ روپے کی معقول رقم خرچ کر لیتے ہیں۔ انہیں غلہ بھی مل جاتا ہے اور لکڑی بھی تو پھر اب دونوں بازار کفن لانے کیوں ساتھ ساتھ جاتے ہیں؟ جب کہ پڑوسی مدد کر رہے ہیں وہ لوگ "بانس وانس کاٹنے جاتے ہیں۔ رقیق القلب عورتیں آ کر دیکھتی اور چلی جاتی تھیں۔ ایسی حالت میں تو کسی ایک کا رکنا واجب تھا۔

دراصل یہ سوال مہذب معاشرے کے لیے ہے۔ یہ وہ افراد ہیں جہاں انسانی قدریں ختم ہو چکی ہیں تو دکھاوا بھی مٹ چکا ہے۔ ان میں وہ منافقانہ ذہانت ہے ہی نہیں۔ یہ تو استحصالی طبقے کی صفت ہے تبھی تو فنکار نے ٹھاکر کی بارات کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور اسے دریا دل ٹھہرایا ہے اور زمیندار کو رحم دل آدمی بتایا ہے۔

کفن میں مرکزی کرداروں کے مکالمے، افسانہ نگار کے وضاحتی بیانات اور جابجا بکھرے ہوئے سماجی نشیب و فراز افسانہ کے لہجہ کو طنز کا ایسا آہنگ دیتے ہیں کہ تمام تخیلی عناصر اس میں ڈوب کر رہ جاتے ہیں اور افسانہ ایک مکمل طنز کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ یہ افسانہ اپنی ابتدا سے ہی رنج و الم میں ڈوبا ہوا غم و اندوہ اور اداسی سے رچی بسی فضا میں پروان چڑھتا ہوا انجام کو پہنچتا ہے یہی فضا افسانہ کے آہنگ سے شیر و شکر ہو کر اس کی تیزی اور تندی کو اور بڑھا دیتی ہے۔ تلخ نفسیاتی حقیقت اور پر پیچ شخصیت پر مشتمل مذکورہ افسانہ میں مرکزی کرداروں کی گفتگو خاصی معنویت رکھتی ہے۔ پریم چند نے ان مکالموں کے سہارے افسانہ کو مختلف فنی منازل سے گزار کر انجام تک پہنچایا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ان کی باہمی باتوں کے درمیان افسانہ نگار کی مہیا کردہ تفصیلات نے افسانہ کو جیتی جاگتی دنیا سے ہم آہنگ کر دیا۔ کرداروں کا مکمل تعارف، سماجی پس منظر اور محرکات و عوامل کہ جنھوں نے اس کے نشو و نما میں حصہ لیا ہے اور دیگر جزئیات، مکالموں کے درمیان اس طرح سمو گئے ہیں کہ ان کے قول و فعل کا جواز پیدا ہو جاتا ہے اور قاری خود کو ایک حقیقی

Scanned by CamScanner

لیکن کلفتوں سے بھرپور جہاں میں سفر کرتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

افسانے کے ابتدائی جملے فنی اعتبار سے خاصے اہم ہیں۔ پریم چند نے ان جملوں سے کئی معرکے سر کیے ہیں۔ اس کے مرکزی کرداروں، ان سے متعلق جزئیات اور پس منظر کو سرپیت کے عنصر میں ڈبو کر اس طرح متعارف کرایا ہے کہ پڑھنے والے کی پوری توجہ آئندہ آنے والے واقعات پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ وہ دل جمعی سے افسانہ پڑھنے کے لیے خود کو تیار پاتا ہے اور انجام جاننے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ افسانہ کے تمہیدی جملے میں باپ اور بیٹے کو ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے بیٹھے ہوئے بتایا گیا ہے:

''جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے
الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔''

''یہ بجھا ہوا الاؤ'' ان گنت اشارے کرتا ہے اور قاری کو مختلف زاویوں سے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ افسانہ نگار اگلے جملے میں بتاتا ہے کہ جاڑوں کی رات ہے فضا سناٹے میں غرق ہے۔ سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا ہے۔ یہ جملہ پیش آئند واقعات کی تمہید ہے۔ ان کا جواز ہے اور ستم ظریفی کا اشاریہ ہے جس نے انسان کو انسان نہیں رہنے دیا اور تمہید بھی کہ معاشرے میں ایسے واقعات فروغ نہ پائیں۔

تمہید کے بعد گھیسو اور مادھو کی ابتدائی گفتگو صورت حال کی سنگینی میں اضافہ کرتی اور قاری کے ذہن اور اعصاب کو متاثر کرتی ہے۔ اس جگہ کرداروں کا تفصیلی تعارف خاصا اہم ہے۔ افسانہ نگار اس تعارف کے سہارے، افسانہ کے پس منظر کو ابھارتا ہے، اس کے ماحول کو دھرتی کی فضا سے ہمکنار کرتا ہے۔ مجموعی تاثر کے لیے راہیں بناتا سنوارتا ہے اور قاری کے ذہن کو پیش آیند واقعات کے لیے ہموار کرتا ہے۔ اس کے باوجود ان کی اگلی گفتگو اور قلبی واردات سے واقف ہو کر قاری شدید ذہنی صدمہ سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کو ان کی حرکات وسکنات غیر فطری معلوم دیتی ہیں۔ وہ خوف اور دہشت کے احساس تلے

Scanned by CamScanner

دب جاتا ہے۔ بہو اندر آخری سانسیں لے رہی ہوتی ہے۔ باہر ان کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آتا ہے۔ باپ بیٹے ہیں کہ مزے سے آلو کھاتے اور پیٹ بھرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ قاری کو اس وقت اور بھی زیادہ اذیت ہوتی ہے جب پیٹ بھرنے کے بعد وہ دونوں وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر اطمینان سے سو جاتے ہیں اور بدھیا مسلسل تکلیف سے کراہتی اور رہ رہ کر چیختی رہتی ہے۔ یہ صورت حال قاری کے ذہن کو کش مکش میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس کا یقین افسانہ کی صداقت پر متزلزل ہو جاتا ہے۔ لیکن افسانہ نگار قاری کو اپنا ہم نوا بنانے کے ہنر سے پوری طرح واقف ہے۔ وہ سماجی ناانصافیوں کا ذکر شروع کر دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ کس طرح استحصال کے نتیجہ میں منفی ردعمل کے طور پر ان کرداروں کا وجود عمل میں آیا ہے

"جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بین تھا اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین و ادب کی پابندی بھی کرتا۔ اس لیے جہاں اس جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مکھیا بنے ہوئے تھے اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا۔ پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم از کم اسے کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور

Scanned by CamScanner

بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔''

گھیسو اور مادھو کا یہ احساس کہ کام کرنے سے بھی ان کے لیے بہتری کی کوئی صورت نکلنی ممکن نہیں تو پھر آخر وہ محنت و مشقت کیوں کریں جب کہ فارغ البالی ان کے لیے ہے جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ استحصالی طبقے کی چال جو انہیں کچل کر حیوان بنا چکی ہے آخر ان کے توڑے ٹوٹ تو نہیں سکتی ہے تو پھر اس فولادی دیوار سے سر ٹکرانے کی کوشش کیوں کریں؟ بلکہ اس غلامی سے بہتر ہے کہ چوری کر کے دو چار سانسیں سکھ چین کی لے لی جائیں، کم از کم اس میں خود مختاری کا احساس تو ہے۔ ان کے لیے اتنی ہی تسکین کافی ہے کہ اگر وہ خستہ حال ہیں تو انہیں'' کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی۔''اور ان کی ''سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔'' ان کے اس طرز فکر، احساسات، لگاتار فاقے، تنگ دستی اور مجبوری نے ان کو اس مقام تک پہنچا کر اس طرز عمل کے لیے مجبور بنایا ہے۔ افسانہ نگار نے پہلی بار ان کے اعمال و افعال کے لیے جواز فراہم کیا ہے۔ وہ گھٹے ہوئے ماحول سے قاری کو نجات دلانے کے لیے گھیسو کی زبانی بارات کی داستان سنا کر خوشگوار یادوں کی ایک بستی آباد کرتا ہے اور قاری کو وہاں پہنچا کر اس کے لیے راحت کے چند عارضی لمحے مہیا کرتا ہے۔ فاکر کی برات کے ذکر نے کہانی کی آہستہ روی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ ماضی کے طلسم سے قاری باہر نکلتا ہے تو دونوں پانی پی کر وہیں سو چکے ہوتے ہیں:

''جیسے دو بڑے اژدر کنڈلیاں مارے پڑے ہوں۔''

دونوں کا'' دو بڑے اژدر'' کی طرح بے فکری سے سو جانا ایک سوالیہ نشان بن کر سامنے آتا ہے اور دعوت فکر و عمل دیتا ہے۔ یہ دونوں افراد اسی سماج کے پیدا کردہ ہیں۔ ''جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ زیادہ اچھی نہ

Scanned by CamScanner

تھی۔ جن کو آبادی سے پرے، باڑوں میں جانوروں کی طرح زندگی گزارنے کے لیے مجبور کر دیا گیا تھا۔ تعلیم سے بے بہرہ، فاقوں کے مارے، ہر طرح سے مجبور، بے کس اور لاچار۔ یہ کر سکنے کے قابل کیسے اور کس طرح ہوتے؟ دردزہ میں وہ کیوں کر مددگار ہو سکتے ہیں؟ بے بسی کی انتہا۔ مستقبل سے ان بے نیازوں کو فرار کا راستہ دکھلاتی اور وہ پڑ کر وہیں سو جاتے ہیں۔

افسانہ نگار اگلے حصہ میں بدھیا کی موت کی خبر سناتا ہے۔ کہانی کے سارے تانے بانے اسی موت کے گرد بنے گئے ہیں جب کہ اس کا عملی وجود کہیں نظر نہیں آتا۔ صرف اس کی کراہیں سنائی دیتی ہیں۔ افسانہ کی ابتدا میں کش مکش اور اس کے نتیجے میں مصنوعی تناؤ کا آغاز جن چیزوں سے ہوتا ہے انجام کار اس کی موت پر ختم ہو جاتا ہے۔ بدھیا کی بے کسی موت قاری کو خوف و دہشت میں مبتلا کر دیتی ہے:

> "صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے منھ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں، پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔"

بدھیا افسانہ کا اہم ترین کردار ہے۔ اس کی موت کے بعد بھی، اس کا تعلق پورے افسانے سے قائم رہتا ہے اور اسی تعلق سے تمام تشکیلی عناصر سرگرم رہتے ہیں۔ بدھیا کی موت نے دونوں کرداروں کو متحرک کر دیا ہے۔ اس کی زندگی میں صرف باتیں بنانے والے اس کے مرنے کے بعد اتنے چاق و چوبند ہو جاتے ہیں کہ ایک گھنٹہ کے اندر پانچ روپے کی رقم چندہ سے جمع کر لیتے ہیں۔

مصنف کا قلم افسانہ میں ابتدا ہی سے تجسس کو بیدار رکھتا ہے لیکن آخر حصہ میں اس کا قلم اس حد تک [illegible] کہ قاری افسانہ کے ہر آنے والے لمحہ کو جاننے کے لیے بے

تب رہتا ہے۔ افسانہ کے اس حصہ کا مکمل انحصار باپ بیٹے کے مکالموں پر ہوتا ہے۔ ان مکالموں کے وسیلہ سے افسانہ تیز رفتاری سے تمام مراحل طے کرتا ہوا انجام کو پہنچتا ہے اور کرداروں کی تہہ دار شخصیت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ پریم چند نے اس موقع پر ان کرداروں کے ذریعہ سماج کے عقائد توہمات اور رسم و رواج پر بڑے ہی نپے تلے انداز میں کاری ضرب لگائی ہے اور اس پورے معاشرے پر طنز کیا ہے جو ان کی خستہ حالی کا اصل ذمہ دار ہے۔ گھیسو کے لفظوں میں:

> "کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کفن چاہیے یہی پانچ روپے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے کفن لگانے سے کیا ملتا۔ آخر جل ہی تو جاتا۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔"

دونوں کفن نہ خرید کر رسم و رواج کو موضوع سخن بناتے ہیں، اس پر لعن طعن کرتے ہیں۔ کفن کی اہمیت کم کرنے کے جواز تلاش کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پیسے آجاتے تو دنیاوی قدروں کو پامال کر کے اپنی خواہشات کی تکمیل کی سوچتے ہیں۔ دونوں باپ بیٹے بازار پہنچ کر ادھر ادھر گھومتے ہیں۔ یہاں تک کہ شام ہو جاتی ہے۔ اس مقام پر حساس قاری کا ذہن سوچنے کے لیے مجبور ہوتا ہے کہ گاؤں کے بازار میں ایسی کون سی جگہیں تھیں جہاں موجودہ سچویشن میں دونوں افراد گھومتے رہے یا وہ بازار کس قدر وسیع تھا کہ گھومنے پھرنے میں شام ہو گئی؟ لیکن افسانہ کی اگلی سطور قاری کے ذہن کو فوراً ہی اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ "دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانہ کے سامنے" آپہنچے ہیں۔ خاموشی سے اندر داخل ہو جاتے ہیں۔ گھیسو ایک بوتل شراب اور کچھ گزک خریدتا ہے اور دونوں پینے بیٹھ جاتے ہیں۔ شراب ان کو سرور میں لے آتی تو گفتگو کا سلسلہ پھر شروع ہو جاتا ہے۔ آدھی بوتل ختم ہو جاتی تو کھانے کا سامان منگا لیتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

"دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوڑیاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انہوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔"

افسانہ نگار نے اس سے پہلے بھی ابتدا میں ان دونوں کے تعلق سے بہت کچھ بتایا ہے:

"کاش دونوں سادھو ہوتے تو انہیں قناعت اور توکل کے لیے ضبط نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی۔ عجب زندگی تھی ان لوگوں کی۔ گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی ڈھانکے ہوئے، دنیا کی فکروں سے آزاد، قرض سے لدے ہوئے۔ گالیاں بھی کھاتے تھے مگر کوئی غم نہیں۔"

پریم چند نے ان افراد کو افسانہ میں مرکزی کرداروں کی جگہ دے کر وقت کے اہم ترین مسئلہ کی جانب قاری کو متوجہ کیا ہے اور ایک نقیب کے فرائض انجام دیے ہیں۔ ان دونوں کی کردار سازی چند سالوں کا نتیجہ نہیں بلکہ صدہا صدیوں کی مرہون منت ہے۔ نسلاً بعد نسل ان کا موجودہ وجود عمل میں آیا ہے۔ ان کی تشکیل اس سماج نے کی ہے جو دنیاوی اخلاق و ضابطوں سے پوری طرح بندھی ہوئی ہے اور اعلیٰ قدروں کی آڑ میں ہر طرح کا ظلم ان پر روا رکھتی ہے۔ پھر ان اصولوں اور قدروں کا ان پر اطلاق کہاں تک مناسب ہوسکتا ہے اور ان کی شخصیت کو پرکھنے کا معیار وہ ضابطے کیوں کر اور کیسے ہوسکتے ہیں؟ اس دنیا نے جو کچھ بھی انہیں دیا ہے اس کے نتیجہ میں انہوں نے اپنی الگ دنیا بسائی ہے۔ جہاں ان کے اپنے ضابطے اور اصول ہیں۔ جس پر وہ مستقل مزاجی سے عمل پیرا رہتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

"گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور
مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔
بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔"

اس مقام پر حساس قاری محض مکر کے لیے یہ بھی سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ کہیں پریم چند "باپ کے نقشِ قدم" پر چلنے کا سلسلہ ختم کرنے کا جواز تو نہیں پیدا کرتے ہیں اور شاید اسی لیے بچے کو ماں کے پیٹ میں مار دیتے ہیں اور اسے فطری کفن مہیا کرا دیتے ہیں؟ ورنہ کہانی کا انجام تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بچے کی پیدائش کے بعد ماں کی موت ہو گئی اور حرام خوری کا سلسلہ دراز ہو گیا۔ کیونکہ کریا کرم کے بعد وہ بچے کی پرورش کے لیے سماج سے کچھ نہ کچھ وصول کرتے رہتے اور پھر اس کے دو ہاتھ کاموں کے لیے مددگار ثابت ہوتے۔ لیکن پریم چند دراصل ان دو کرداروں کے توسط سے انسان کی ریاکاری، تہہ دار شخصیت اور خواہش نفسانی کو بھی بے نقاب کرنا چاہتے تھے اور یہ دکھانا چاہتے تھے کہ دیکھو اشرف المخلوقات کس حد تک گر سکتا ہے، اپنے کو فریب میں مبتلا کر سکتا ہے یا زندہ رہنے کے لیے حالات سے سمجھوتہ کر سکتا ہے۔ اسی لیے تو کہانی کے بہت سے رموز اس وقت آشکارا ہوتے ہیں جب نشہ ان پر غالب آ کر ان کی ظاہری شخصیت کو تہہ و بالا کر دیتا اور ان چڑھے ہوئے غلاف کو اتار پھینکتا ہے۔ تہہ دار شخصیتوں میں پنہاں نفسیاتی گرہیں کھل کر ان کے مکالموں کے ذریعے سامنے آ جاتی ہیں۔ وہ اعلیٰ انسانی قدروں کو زیر بحث لاتے ہیں اور اس سماج پر طنز کرتے ہیں جو بظاہر ان کی طرف داری کرتا اور ان پر رحم دکھاتا ہے۔ اس کے اظہار کے لیے مالی امداد کرتا ہے لیکن یہ رحم کبھی مذہبی اجارہ داری برقرار رکھنے کے لیے، کبھی ظاہری شان و شوکت دکھانے کے لیے اور کبھی سماجی و اخلاقی قدروں کے پیش نظر کیا جاتا ہے گو کہ یہی لوگ اس زنجیر کی کڑی ہوتے ہیں جس کے شکنجہ میں جکڑ کر اس طبقہ کا استحصال کیا گیا ہے۔ زمیندار تو ان کا اعلیٰ ترین نمائندہ ہوتا ہے مگر وہ بھی دونوں باپ بیٹے کی امداد کے لیے مجبور

Scanned by CamScanner

"مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی"

بڑھیا کی تکلیف اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی ہے

"مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔"

اس پر گزرنے والی ہیجانی کیفیت اور قلبی واردات کی تنگ دستی اور مفلسی میں کفِ افسوس ملنا تو ممکن ہے مگر "دوا دارو" کا بندوبست ممکن نہیں۔ اس بات سے ظاہر ہو جاتی ہے

"میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہو گا۔ سونٹھ، گڑ، تیل کچھ تو
نہیں ہے گھر میں۔"

ایک طرف کربناک چیخوں کا سامنا ہوتا ہے تو دوسری طرف بھوک کی شدت کا۔ بھوک مٹانے کا سامان موجود ہوتا ہے لیکن بڑھیا کو تکلیف سے نجات دلانے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا ہے۔ یوں بھوک کا احساس تمام صعوبتوں پر غالب آ جاتا ہے۔ یہ بھوک ہی کا اثر تھا کہ جلتے ہوئے آلو حلق سے اتارتے چلے گئے۔ کیوں کہ:

"کل سے کچھ کھایا نہ تھا۔ اتنا صبر نہ تھا کہ انہیں ٹھنڈا ہونے دیں۔"

افلاس کے زیرِ سایہ پلنے والی محرومیوں کا اندازہ مادھو کی اس بات سے بھی ہو جاتا ہے کہ:

"آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔"

اس کے باوجود ان کے پیٹ بھرے ہوتے تو وہ کھانے کا بچا ہوا سامان سنبھال کر رکھنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کرتے اور مادھو "پوریوں کا پتل اٹھا کر ایک بھکاری کو" دے دیتا ہے۔ آخر میں بڑھیا کی موت پر اپنے خیالات کا اظہار وہ روتے ہوئے اس طرح کرتا ہے:

"بچاری نے زندگی میں بڑا دکھ بھوگا۔ مری بھی کتنا دکھ جھیل کر۔"

اس ایک جملہ میں جس بیچارگی، اپنائیت اور مجبوری کا احساس دم توڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ مادھو کے قلبی کرب کا پتہ دیتا ہے۔

گھیسو، مادھو کے مقابلہ میں کہیں زیادہ جہاندیدہ ہے۔ ساٹھ سالوں میں ہے

شمار زخموں کو جھیل کر وہ دنیاوی آلام کا خاصا تجربہ رکھتا ہے، اس کو بھی بدھیا کی تکلیف کا پورا احساس ہے۔ اس کی پنہاں قلبی اذیت اس کی باتوں سے ظاہر ہو جاتی ہے:

"معلوم ہوتا ہے بچے کی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا، جا دیکھ تو آ۔"

بدھیا کی تکلیف سے متاثر ہو کر وہ مادھو کو ڈانٹتے ہوئے کہتا ہے:

"تو بڑا بے درد ہے بے! سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا اسی کے ساتھ اتنی بے دپھائی"

گھیسو سماج کے رکھ رکھاؤ سے بخوبی واقف ہے۔ اس کو یہ واقفیت ذاتی تجربوں سے حاصل ہوئی ہے۔ اس کے نو بچے ہوئے۔ ان مواقع پر اسے جن مراحل سے دوچار ہونا پڑا اس کی یادداشت میں محفوظ ہیں۔ مادھو اپنے ہونے والے بچے کی جانب سے فکرمند ہوتا ہے تو وہ اس کو سمجھاتے ہوئے کہتا ہے:

"سب کچھ آ جائے گا۔ بھگوان بچہ دیں تو۔ جو لوگ ابھی ایک پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہ تب بلا کر دیں گے۔ میرے نو لڑکے ہوئے۔ گھر میں کبھی کچھ نہ تھا مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا۔"

وہ زمانہ کی اونچ نیچ دیکھے ہوئے ہے۔ انسانوں کی فطرت، مہذب سماج کی ظاہرداری اور کھوکھلے پن کو جانتا ہے۔ اس کا ایسے سماج پر اعتماد جو ان کی موجودہ حالت کا ذمہ دار ہے، قابل توجہ اور باعث غور و فکر ہے کیوں کہ یہی اعتماد کسی حد تک ان کے طرز عمل کا ذمہ دار بھی ہے:

"تو کیسے جانتا ہے اسے کفن نہ ملے گا۔ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال دنیا میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کفن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے۔ وہی لوگ دیں گے جنھوں نے اب کی دیا۔ ہاں وہ روپے ہمارے ہاتھ نہ آئیں

گے اور اگر کسی طرح آ جائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے ملیں
گے اور جھن تیسری بار ملے گا۔''

ہولوں کا بھی قدروں پر یقین کامل ہے۔ مادھو بھگوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''اے ایشور پاپی ہوں'' اور گھیسو کا یہ کہنا کہ ''ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اسے پن نہ ہوگا'' اس بات کی علامت ہے کہ نیکی اور دان پن کا تصور ان کے یہاں موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے سماج کے غیر انسانی سلوک نے ان کو اسی کش مکش میں مبتلا کر رکھا ہے لیکن ان کے اس یقین کو متزلزل نہیں کر سکا۔ مسلسل حق تلفیاں اور غیر منصفانہ رویہ ان کی فکر پر اثر انداز ہوا ہے

''ہاں بیٹا بیکنٹھ میں جائے گی۔ کسی کو ستایا نہیں، کسی کو دبایا نہیں۔
مرتے وقت ہماری زندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کر گئی۔ وہ نہ
بیکنٹھ میں جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو
غریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ کو دھونے کے
لیے گنگا میں جاتے ہیں اور مندر میں جل چڑھاتے ہیں۔''

ان کے پیٹ بھرے ہوتے ہیں تو وہ بھی عام انسانوں کی طرح دنیا کو برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مادھو بھکاری کو کھانے کا بچا سامان دے دیتا تو گھیسو بھکاری سے کہتا ہے

''لے جا۔ خوب کھا اور اسیر باد دے۔ جس کی کمائی ہے وہ تو مر گئی
مگر تیرا اسیر باد اسے ضرور پہنچ جائے گا۔ روئیں روئیں سے اسیر باد
دے بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔''

ان کے ذہنوں میں بھی آخرت کا تصور پوری طرح جلوہ گر ہے۔ اور [illegible] سے گھیسو کا مادھو کو سمجھانا عام انسانوں کی طرح قابل توجہ ہے:

''کیوں روتا ہے بیٹا۔ خوش ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی، جنجال
سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن

"توڑ دیتا ہے"

گھیسو اور مادھو کے کردار غیر فطری، غیر حقیقی یا غیر انسانی نہیں بلکہ یہ پریم چند کی بے پناہ قوت مشاہدہ کا نتیجہ ہیں۔ دونوں کرداروں کا وجود مسلسل ناکامی، حقارت، تذلیل اور "استحصال" کا پیدا وار ہے۔ یہ دونوں کچلے ہوئے پسماندہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو سماجی، معاشی ناانصافی اور استحصالی اقدار کے تئیں منفی ردعمل کے طور پر وجود میں آئے ہیں۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ "کفن" پریم چند کی بڑی کامیاب فنی تخلیق ہے۔ اس میں ان کا مشاہدہ، فکر، تخیل، زبان و بیان اور فنی صلاحیتیں معراج کمال پر پہنچی ہوئی ہیں۔ فلمی تکنیک پر لکھے اس افسانہ کا انداز بیان بالکل حقیقی محسوس ہوتا ہے۔ سارے واقعات از اول تا آخر ڈرامائی انداز میں بتدریج رونما ہوتے ہیں۔ افسانہ کے تمام ضروری اجزاء اچھی طریقہ سے گھتے ہوئے ہیں۔ زندگی کی کشمکش اور مسائل ابتدا ہی سے سامنے آتے ہیں اور ان کا تذکرہ رفتہ رفتہ اس طرح آگے بڑھتا ہے کہ پڑھنے والے کی دلچسپی اور تجسس قائم رہتا ہے۔ تحیر، خوف، دہشت، رقت اور اسرار کے تمام عناصر اپنے اندر سموئے ہوئے یہ افسانہ اختتام پر اپنا بھرپور اور مکمل تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ یہ تاثر دماغ میں چنگاریاں سی پیدا کر دیتا ہے۔ تاریخ کی تاریک ترین حقیقت پر غور کرنے کے لیے مجبور کرتا ہے کہ کس طرح سماجی شکنجے میں ایک طبقہ کو دبایا، کچلا اور پیسا گیا کہ ان کی ساری شخصیت ہی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی اور وہ سماج کے لیے ایک مسئلہ بن گئے۔ اس طویل لرزہ خیز داستان کو پریم چند نے بڑے فنکارانہ انداز سے چند سطروں میں قلم بند کیا ہے اور ہندوستانی دیہاتوں میں طبقاتی کشمکش کے استحصال کے نتیجہ میں پھیلی افلاس کی کہانی سنا کر وہ وقت کی نازک ترین ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

~~~~~~~~~~

Scanned by CamScanner
~~~~~~~~~~

حوالہ جات

۱۔ افسانہ حقیقت سے علامت تک، سلیم اختر، ص ۱۸۱

۲۔ افسانہ نگار پریم چند (اردو افسانہ روایت اور مسائل)، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ص [illegible]

۳۔ تنقیدی اشارے، پروفیسر آل احمد سرور، ص ۴۰

۴۔ پریم چند کے اسلوب کا ایک پہلو، شمس الرحمن فاروقی ([illegible] ۱۹۹۰)، ص [illegible]

۵۔ کفن کے حوالے سے پریم چند کی پہچان، پروفیسر ابوالکلام قاسمی ([illegible] ۱۹۹۰)، ص ۴۴

Scanned by CamScanner